باب۔ ۱۹

ترجمہ

فص ایّوبیہ

حکمت غیبیہ

جانو کہ سرّ حیات و رازِ زندگی یعنی وجودِ حق، "پانی" یا فیض نفسِ رحمانی یا فیض اقدس و مقدس میں جاری و ساری ہے۔ پس پانی اصلِ عناصر و ارکان ہے۔ یہی وجہ ہے (کہ) اللہ تعالیٰ (نے) تمام اشیا کو پانی ہی سے حی و زندہ کیا، اور رکھا۔ سچ پوچھو تو ہر شئے زندہ ہے اور اس میں سرّ حیات ہے۔ اس لیے کہ ہر شئے اللہ کی تسبیح و تحمید کرتی ہے مگر ہم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، مگر یہ کہ اللہ کی طرف سے کشف ہو۔ ظاہر ہے کہ جو زندہ ہو گا وہ تسبیح کرے گا۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ ہر شئے زندہ اور حی ہے۔ پس ہر شئے کی اصل پانی و فیضِ الٰہی ہے۔ دیکھو! عرشِ سلطنت الٰہی، آبِ فیض اقدس پر تھا، کہ وہ عرش اسی آبِ فیض سے بنا ہے۔ اسی سے بلند ہوا اور اُٹھا ہے۔ وہ آبِ فیض ہی اس عرشِ حکومت کی حفاظت کرتا ہے۔

اللہ نے انسان کو بندہ بنایا اور وہ خود اپنے پروردگار سے لگا تکبر کرنے اور سربلند سمجھنے۔ حق تعالیٰ، باوجود بندے کی اس خود پسندی کے اور اپنی حقیقت سے جاہل رہنے کے، تحت اور باطن سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ جاہل خود کو سب سے فوق (یا اعلیٰ) سمجھتا ہے۔ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، [(حدیثِ ترمذی ہے)، لو دلّیتم بحبل لهبط علی الله، (یعنی)] اگر رسی باندھ کر ڈول ڈالو گے تو حق تعالیٰ ہی پر اترے گا۔ حضورؐ اشارہ فرماتے ہیں کہ اللہ کچھ جانبِ فوق ہی میں منحصر نہیں ہے۔ اس کو تحت و فوق دونوں برابر ہیں۔ (وہ) جیسے اوپر ہے، ویسے ہی نیچے بھی ہے۔ (اللہ تعالیٰ) فرماتا ہے، يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ، (یعنی) وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں جو ان کے اوپر ہے، (النحل:۵۰)۔ اور فرماتا ہے، وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ، (یعنی) وہ اپنے بندوں پر قاہر و زبردست ہے، (الانعام:۱۸ اور ۶۱)۔ فوق و تحت سب اُس کے ہیں۔ یہ جہاتِ ستّہ صرف انسان کے لحاظ سے ہے جو صورتِ رحمان پر ہے۔ اللہ کے سوا کوئی مطعم، کھلانے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ گروہِ موسویؑ و عیسویؑ کے متعلق (سورۃ المائدۃ کی آیت ٦٦ میں) فرماتا ہے، وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ، (یعنی) اگر وہ قائم رکھتے احکام تورات اور انجیل کو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تعمیم کی (اس بات کو عام کیا) اور فرمایا، وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ، (یعنی) اور ان احکام کو قائم رکھتے جو ان کے رب کے پاس سے نازل کیے گئے ہیں۔ ہر حکم جو کسی رسول کی زبان پر یا الہام سے اترا ہو اس میں داخل ہے۔ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ، (یعنی) تو وہ اپنے اوپر سے آنے والے کو کھاتے۔ وہ مطعم ہے کھلانے والا ہے، کیوں کہ فوق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے۔ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم، (یعنی) اور اپنے پاؤں کے نیچے سے۔ وہی کھلانے والا ہے تحت سے بھی۔ ترجمانِ خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے تحت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے جو حدیث، لو دلّیتم بحبل لھبط علی اللہ، (یعنی) اگر ڈول کو رسی کے ساتھ چھوڑو گے تو خدا ہی پر اُترے گا، (حدیثِ ترمذی)، سے ثابت ہے۔

اگر عرشِ سلطنت آبِ فیض پر قائم نہ ہوتا تو اس کا وجود بھی قائم نہ رہتا۔ (اس لیے) کہ حی اور زندہ کا وجود، حیات ہی سے محفوظ رہتا ہے۔ دیکھو! زندہ جب عرفی معمولی موت سے مر جاتا ہے تو اس کے اجزاے نظام تحلیل ہو جاتے ہیں، اور اس نظم خاص کی قوتیں معدوم ہو جاتی ہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے ایوبؑ کو فرمایا، ارْكُضْ بِرِجْلِكَ هَـٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ، (یعنی) تم اپنی لات مارو، یہ نہانے کی ٹھنڈی جگہ ہے، (ص:۴۲)۔ یہاں مغتسل سے مراد، پانی ہے۔ حضرت ایوبؑ کو غم والم کی حرارت بافراط تھی۔ اللہ تعالیٰ نے پانی کی سردی سے ان کو تسکین دی۔ دیکھو! طب کیا کرتی ہے۔ زائد کو کم (اور) ناقص میں زائد کرتی ہے۔ علاج کا مقصد طلبِ اعتدال ہے۔ مگر اعتدالِ حقیقی ناممکن الحصول ہے۔ اس کی طرف راہ نہیں۔ تاہم طبیب طبیعت کو اعتدالِ حقیقی سے قریب تر کر دیتا ہے۔ عارف کے پاس اعتدال یہ ہے کہ محبت، صحو محض (بیداری)، صاف ہشیاری (ہوشمندی) اور سُکر خالص (بے ہوشی) خالص نشے کے درمیان ہو۔

ہم نے یہ کہا تھا کہ اعتدالِ حقیقی کی طرف راہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معرفتِ حقائق اور کشف و شہود سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر آن، ہر لحظہ علی الدّوام (یعنی مسلسل) سلسلۂ تکوین جاری ہے۔ یعنی تجددِ امثال ہے۔ فنا بھی ہے، وجود بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ تکوین و ایجاد، بغیر میل و رغبتِ خاص کے ہو نہیں سکتی۔ اس میل کو طبیعتِ حیوانی میں "انحراف" اور طبائع غیر حیوانی میں "تعفین" کہتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کے حق میں ارادہ رکھتے ہیں۔ ارداہ کیا ہے۔۔؟ میلانِ حق ہے مرادِ خاص کی طرف۔ کسی اور طرف کی میلان نہیں۔ اعتدال کے معنی تو یہ ہیں کہ تمام اجزا میں تساوی ہوتی ہے، اور وہ باہم برابر ہوتے ہیں۔ (لیکن) یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے کہا کہ اعتدالِ حقیقی موجود نہیں۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ

خدائے تعالیٰ مختلف صفات سے موصوف ہے۔ رضا (یا خوشی) سے بھی موصوف ہے اور غضب (یا غصّے) سے بھی۔ رضا، غضب کا دور کرنا ہے اور غضب، مزیلِ رضا (یعنی مرضی کو ہٹا دینا) ہے۔ اعتدال تو یہ ہے کہ رضا و غضب دونوں باہم مساوی ہوں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ غضب کرنے والا، ایک شخص سے راضی بھی ہو اور غضب بھی کرے۔ پس اس شخص پر دو حکموں میں سے ایک حکم، ایک صفت سے موصوف ہو گا۔ یہی میلان ہے۔۔۔ اسی طرح ایک شخص، ایک شخص سے راضی و ناراض دونوں نہیں ہو سکتا۔ پس اس صورت میں بھی دو متضاد حکموں میں سے ایک سے موصوف ہو جائے (گا)۔ اور یہ بھی میل ہے (موافقت ہے)۔

ہماری یہ ساری تقریر اس لیے ہے کہ بعض لوگوں کے زعم میں اہلِ نار پر دائماً و ابداً غضبِ خدا رہے گا اور کبھی ان دوزخیوں پر رضا و رحمت، اللہ کی طرف سے نہ ہو گی۔ مگر ہمارا مقصد تو صحیح ہے کہ اللہ کے غضب سے اللہ کی رحمت، سابق (یعنی کہیں آگے) ہے۔

اگر ہم جیسا کہتے ہیں درست ہے تو مآل و انجام دوزخیوں کا یہ ہو گا کہ ان سے رنج و الم دور ہو جائے گا۔ مگر رہیں گے دوزخ ہی میں۔ یہ اس کی رضا کا اثر ہے۔ جب دوزخیوں کا رنج نہ رہے گا تو خدائے تعالیٰ کا غضب بھی نہ رہے گا، کیوں کہ بندے کا الم نتیجۂ غضبِ خدا ہے۔ اس کو سمجھتے تو کیا اچھا ہوتا۔ جس کو غصہ آتا ہے، جو غضب کرتا ہے، اس کو اذیت پہنچتی ہے۔ تکلیف ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ خود کو کسی طرح راحت دینا چاہتا ہے۔ جس پر غصہ آیا ہے اس کو تکلیف پہنچا کر۔ حقیقت میں غصہ کرنے والے کا رنج اس شخص کو پہنچتا ہے جس پر غصہ ہوا ہے۔ جب حق تعالیٰ کو تمام عالم سے مجرد (یعنی) علاحدہ کر کے دیکھو تو وہ پاک ہے، منزّہ و مبرّا ہے اس صفتِ امکانی سے، اِس قدر غضب و راحت اور انتقام لینے سے۔ جب حق تعالیٰ ہی حقیقتِ عالم ہے (تو) یہ تمام احکام امکانیہ کہاں ظاہر ہوئے۔۔؟ خود اسی میں، اور پیدا ہوئے تو خود اسی میں۔ یہ مراد ہے قولہٗ تعالیٰ (کی)، وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ، (یعنی) سب کا مرجع وہی ہے، (ھود:۱۲۳)۔ یہ بات حقیقتاً بھی ہے اور کشف سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

اُس کی (یعنی اللہ تعالیٰ کی) عبادت کرو۔ اُسی پر توکل کرو۔ اور سب کاموں کو اُس پر چھوڑ دو۔ خود کو اپنی نظر سے چھپا لو۔ دائرۂ امکان میں اِس عالم سے زیادہ عجیب و غریب چیز کوئی نہیں۔ کیوں کہ وہ صورتِ رحمان کی جلوہ گری ہے۔ اللہ نے عالم کو پیدا کیا، یعنی وجودِ حق تعالیٰ کا ظہور، ظہور عالم سے ہوا۔ جیسے حقیقتِ انسانی وجودِ صورتِ طبعی و جسم مادّی و عنصری سے ظاہر ہوئی ہے۔ ہم وجودِ حق کی صورتِ ظاہری ہیں۔ اور ذاتِ حق اس صورتِ مدبّرہ کی روح ہے۔ تدبیر کس میں ہوئی۔۔؟ خود اُس میں۔ اور پیدا کہاں سے ہوئی۔۔؟ خود اُس سے۔

حق تعالیٰ معنیٰ و باطن کے لحاظ سے اوّل ہے۔ اور صورت اور نمائش کے لحاظ سے آخر ہے۔ احکام و احوال کے بدلنے سے ظاہر ہے۔ اور تدبیر و تصرف کے لحاظ سے وہ باطن ہے۔ وہ ہر شئے کو جانتا ہے۔ وہ ہر شئے کو دیکھتا ہے تاکہ مشاہدہ ہو جائے۔ علم شہودی ہو جائے، نہ کہ تخیلات و علم نظری و فکری۔۔۔ عرفا کا علم بھی ذوقی ہے، شہودی ہے، نہ کہ فکری و تخیلاتی۔ حق یہ ہے کہ علم ذوقی و شہودی ہی علم صحیح ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہم و گمان، اٹکل اور تخمین ہے۔ اس قابل نہیں ہے کہ اس کو علم کہا جائے۔

وہ پانی، ایوب علیہ السلام کے پینے کے لیے بھی تھا کہ گرمی اور تکلیفِ تشنگی دور کی جائے۔ تشنگی بھی تکلیف و رنج ہے، ایک قسم کا عذاب ہے۔ شیطان کا اثر ہے۔ اعتبار میں شیطان سے مراد ادراکِ حقائق سے بُعد ہے۔ جب ادراک ہو تو وہ محل قُرب میں ہے۔ پس ہر مشہود جس کا مشاہدہ ہو رہا ہو (وہ) آنکھ سے قریب ہے، گو مسافت میں بعید ہے۔ کیوں کہ مشاہدے کے لحاظ سے نظر و بصر اس سے متصل ہوتی ہے۔ اگر مبصر سے بصر کا اتصال نہ ہو تو وہ کبھی نظر ہی نہ آئے۔ مشہود ہی نہ ہو۔ تم کو اختیار ہے چاہو تو یوں کہو کہ شعاعِ نظر مبصر سے متصل ہوتی ہے، اس تک پہنچتی ہے۔ چاہو یوں کہو کہ مبصر و مشہود کی صورت آنکھ میں منطبع و منقش ہو جاتی ہے (جم جاتی ہے)۔ کچھ ہی کہو۔ بصر و مبصر میں اتصال و قرب ضروری ہے۔ اسی لیے ایوب علیہ السلام مسّ کے ساتھ ضمیر متکلم لائے اور مَسَّنِيَ الضُّرُّ [(یعنی) مجھے بیماری لگ گئی ہے، (الانبیاء:۸۳)] اور اس مسّ و اثر کرنے کو شیطان کی طرف نسبت دی، حالاں کہ مسّ و اثر قریب تھا۔ پھر ایوب علیہ السلام نے کہا، جو بعید تھا اب وہ مجھ سے کسی حکمتِ دراز کی وجہ سے قریب ہو گیا ہے۔

یہ تم کو معلوم ہے کہ قُرب و بُعد امر اضافی ہیں۔ لہٰذا قُرب و بُعد دونوں نسبتیں ہیں۔ انتزاعی ہیں، موجود فی الخارج نہیں۔ باوجود یہ کہ قُرب و بُعد کے احکام قریب و بعید پر جاری ہیں۔

اے طالب! جان لے کہ سرّ الٰہی جو قصۂ ایوبؑ میں بیان کیا گیا ہے، کیوں یہ واقعہ ہمارے لیے باعثِ عبرت (سبق حاصل کرنے)، کتابِ مسطور (پڑھے جانے)، (اور) حکایتِ ملحوظ (یعنی توجہ کے قابل) ہے؟ اس کو پڑھ کر امتِ محمدیؐ کیا نصیحت لے گی۔۔؟ امتِ محمدیؐ اس واقعے سے حضرت ایوبؑ کی پیروی کرے گی۔ اس سے اس کا شرف ترقی کرے گا۔ اس کی بزرگی بڑھے گی۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے ایوبؑ کی تعریف کی، إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِّعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ، (یعنی) ہم نے ایوب کو صابر پایا، وہ کیا اچھا بندہ ہے، اللہ کی طرف بڑا ہی رجوع کرنے والا ہے، (ص:۴۴)۔۔۔ اللہ تعالیٰ تعریف کرتا ہے کہ ایوب علیہ السلام صبر کرتے ہیں، اور دفعِ ضرر کے لیے دعا بھی کرتے ہیں۔

اس سے ہم کو معلوم ہو گیا کہ بندہ اگر دفعِ ضرر کے لیے دعا کرے تو اس کے صبر پر کوئی اعتراض نہیں آتا۔ وہ صابر ہیں۔ نیک بندے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وہ مسبّب کی طرف یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں نہ کہ اسباب کی طرف۔ اللہ ایسے بندے کے لیے اسباب پیدا کر دیتا ہے اور خود اس کا کام کر دیتا ہے۔ کیوں کہ بندہ اللہ ہی پر اعتماد کرتا ہے، اسی کی طرف استناد (یا توجہ) کرتا ہے۔ مضر اشیا کے دفع کرنے والے بہت ہیں (لیکن) مسبب الاسباب تو ایک ہی ذات ہے۔ لہٰذا اس ذات کی طرف رجوع بہتر ہے، جو اسبابِ خاص پیدا کر کے رنج و الم کو دور کرنے والا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ بعض اسباب موثر ہونے میں علم الٰہی کے موافق نہیں۔ وہ (یعنی بندہ) کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول نہیں کی۔ اصل میں اس نے دعا کی ہی کب تھی! اس کا میلان (اور دھیان) تو سببِ خاص کی طرف تھا جو مقتضائے زمانہ و وقت کے مناسب تھا۔

ایوب علیہ السلام نے حکمتِ الٰہی کی اتباع کی۔ کیوں کہ وہ نبی اللہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ صبر، غیر اللہ کی طرف شکوہ نہ کرنا ہے، نہ کہ اللہ کی طرف۔۔۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ صبر مطلقاً شکوہ نہ کرنا ہے، اور ہمارے پاس غیر اللہ کی طرف شکوہ نہ کرنا ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاکی کا شکوہ کرنا رضا بالقضا کے مخالف ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے کیوں کہ رضا بالقضا کے خلاف نہ اللہ کی طرف شکایت ہے نہ کسی اور کی طرف۔ آفت و مصیبت کی شکایت کرنا، بولتے پھرنا، مخالفِ رضا ہے۔ ہم مامور نہیں ہیں کہ مصیبت سے راضی رہیں۔ تکلیف سے ناراض ہونا اور قضا سے ناراض ہونا ایک نہیں۔

ایوب علیہ السلام جانتے تھے کہ رفعِ شکایت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا نہ مانگنا بھی غلطی ہے۔ قہر الٰہی سے مقاومت اور برابری کرنا ہے۔ اپنی طاقت (اور) اپنی بساط کو نہ جاننا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ اس کو مبتلائے آلام کر رہا ہے (تکلیف کے امتحان میں ڈال رہا ہے مگر) وہ خطا کرتا ہے جو خود کو سمجھتا ہے کہ قہر الٰہی کو برداشت کر لے گا۔ اسی لیے تو دفعِ الم کے لیے دعا نہیں کرتا۔ بلکہ صاحبِ تحقیق کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے تضرع و زاری سے (گڑگڑاتے ہوئے) التجا کرے کہ بلا کو دفع فرمائے۔۔۔ عارف (اور) صاحبِ کشف کے خیال میں بندے سے اذیت کا دور کرنا، عین حق تعالیٰ سے دفعِ اذیت کرنا ہے۔ اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے کہ بندوں کی تکلیف سے خود اس کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّـهَ وَرَسُولَهُ (لَعَنَهُمُ اللَّـهُ)، (یعنی) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں (اللہ ان پر لعنت کرتا ہے)، (الاحزاب:۵۷)۔۔۔ بھلا اس سے کیا تکلیف ہو گی کہ اللہ تم کو ایک بلا میں مبتلا کرے اور تم اس سے غفلت میں رہو۔ تم اس کے مرتبے کو نہیں جانتے کہ

وہ تمھارے شکوے کی طرف رجوع کرے اور اس کو دور کرے، اور اس التجا سے تمھاری احتیاجِ ذاتی و افتقارِ حقیقی ظاہر ہو۔ تم حق تعالیٰ سے دفع اذیت کی دعا کروگے تو اس کی تکلیف بھی دور ہو گی، کیوں کہ تم ہی اس کی ظاہری صورت ہو۔

ممکن بود امکاں کہ ہمہ عجز و نیاز زاست

(اللہ کے سوا جو کچھ ہے سب بے بسی اور نیاز مندی ہے)

ایک عارف کو بھوک لگی، تو وہ لگے رونے۔ بعض بد مذاقوں نے ان پر اعتراض کیا۔ اس عارف نے کہا، اللہ نے مجھے اسی لیے بھوکا رکھا ہے کہ میں روؤں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مجھے مبتلاے ضرر و تکلیف اس لیے کیا ہے کہ میں اس ضرر کے دفع کے لیے دعا کروں۔ اظہار تذلیل و عاجزی کروں اور یہ صبر کے خلاف نہیں۔ اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ صبر، غیر اللہ کی طرف شکایت نہ کرنا ہے، نہ کہ اللہ سے دعا بھی نہ کرنا۔

جب غیر اللہ کوئی نہیں تو کس سے شکایت کی جائے، کس سے نہ کی جائے۔۔؟ سب وجوہِ حق ہیں مگر قبلۂ دعا شانِ قیومیت ہے، شانِ وہاب ہے۔ ان سب کا اسم جامع، اللہ ہے۔ اسی وجہ کو مخاطب کر کے دعا کرو کہ دفعِ ضرر ہو، رفعِ اذیٰ ہو (یعنی تکلیف دور ہو)۔ نہ (کہ) وہ وجوہ (ہوں) جن کو اسباب کہتے ہیں۔ ہر چند کہ ذاتِ حق ہی کا سب تفضّل ہے (کرم ہے)۔ جمیع اسباب کا خاص خاص وجوہ سے عین حق ہونا، عارف کو ذاتِ حق سے دفعِ ضرر کے لیے دعا کرنے سے نہیں روکتا۔ اس طریقے کا وہی بندہ پابند ہوتا ہے جو صاحبِ ادب ہو۔ اسرار الٰہی کا امین ہو۔ اللہ کے امین بندوں کو اللہ ہی جانتا ہے، اور بعض اُمَنا (یعنی امانت دار حضرات) بھی بعض کو جانتے ہیں۔ اے طالبِ حق! ہم نے تم کو نصیحت کر دی۔ اب بس مانگو تو اللہ ہی سے مانگو۔